

آجاتا تھا۔

اس روز افسر اعلیٰ جب چڑیا گھر کے جانوروں کو دی جانے والی خوارک ان کی بیماریوں کے لئے دوائیوں اور دیگر انتظامی امور کے حساب کتاب سے فارغ ہوا تو باعتماد کلرک نے اس کے سامنے افسران بالا کا بھیجا ہوا ایک سرکلر رکھ دیا۔
”آخری کیا چاہتے ہیں؟“ افسر اعلیٰ بنے سرکلر کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی یچار گیے کہا۔ باعتماد کلرک ایک مودوب کھانسی کھانا اونڈ گویا ہوا۔ ”ہمارے افسران بالا عوام کو ہم وقت خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پورے ملک میں ایک جشن کی کیفیت جاری رہے۔ لوگ مردوں پر نہ آئیں۔ بلکہ تقریب کا ہوں، پارکوں اور چڑیا گھروں میں آئیں۔ گھروں میں رہ کر کڑھنے سے بہتر ہے کہ انسان تازہ ہو ایں سانس لے اور جانور وغیرہ دیکھے۔“

”اوہو۔ اتنی انگریزی تو میں بھی سمجھتا ہوں۔“ افسر اعلیٰ ناراض ہر کروپلاں کی پہلے تو یہ احکام تھے کہ لوگوں کا تجوم نہ بننے پائے اور اب یہ سرکلر آگیا ہے کہ اپنے چڑیا گھر کے ناظرین کی تعداد میں اگر اضافہ نہیں کرو گے تو تمیں معطل کر دیا جائے گا۔“
”یہ سرکلر میں نے نہیں لکھا۔“ باعتماد کلرک بھی ناراض ہو گیا۔

”ہوں۔“ افسر اعلیٰ نے اپنے ذمہ پر نظر ڈالا۔ ”اگر ہم چند مگر مجھے کچھ بچکالی شیر اور الاؤ وغیرہ حاصل کر لیں تو یات بن سکتی ہے۔“
”مشکل ہے جناب ہمارے پاس ان جانوروں کو درآمد کرنے کے لئے زیباد نہیں ہے۔“

”صرف بچکالی شیر حاصل کر لیتے ہیں۔“
”جناب بچکالی شیر بھی درآمد کرنے ہوں گے۔“ باعتماد کلرک خباثت سے مسکرا۔
”میں اپنی تازیخ سے اتنا ناواقف نہیں ہوں۔“ افسر اعلیٰ اپنی حاقدت پر جھلکا۔
”بہرحال۔ مقامی طور پر کون سے جانور حاصل کئے جا سکتے ہیں؟“
”مقامی طور پر۔“ باعتماد کلرک نے بظاہر کچھ دیر کے لئے سوچا اور پھر سر

کمجا کر کئے لگا "بھیڑیں اور بھیریے"؟

"کیا احمدقا نہ باتیں کرتے ہو، بھیڑیں دیکھنے کون آئے گا۔ اور بھیریے لوگ

مزید خوفزدہ ہوں گے؟"

افسر اعلیٰ اب سوچ میں پڑ گیا، تو کمی کا معاملہ تھا۔

"وچھر۔ کیا کرنا چاہیے؟" بالآخر وہ مجاہدت سے بولا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پر اعتماد کلرک کے ذہن میں تمام مشکل امور کا فی المفہور حل موجود رہتا ہے اور پر اعتماد کلرک نے فی المفہور وہ حل پیش کر دیا۔ "کھاؤں۔"

افسر اعلیٰ نے نام سن کر جائز کا تعین کرنے کے لئے فوراً اپنے ذہن میں دنی کے دیگر وزنوں وغیرہ کے نام دھرائے اور بچھر شرمندہ ہو کر بولا۔ "کھاؤں؟"

"بھی ہاں جناب۔" پر اعتماد کلرک سیدھا ہو گیا "دھی کھاؤں جس کی درجے

ہر جھر کے روز بچھر یا گھر کی رفت بڑھ جاتی ہے"

"کتنے میں طے گا؟" افسر اعلیٰ نے فرما کر۔

"وہ انسان ہے جناب۔"

"ہاں آک درست"

"جناب اگر ہم اسے کسی طور قابل کولیں کرو، صرف جھر کی بجائے ہر روز بچھر آ جایا کرے تو ہمارے ہاں افسران بالا کے ہم کے مطابق میڈل لگ سکتا ہے"

"کھاؤں کو تلاش کیا جائے۔" افسر اعلیٰ نے افسراز حاکمیت کا مظاہرہ

کرتے ہوئے گرج کر کرہا۔

با اعتماد کلرک کو کھاؤں تلاش کرنے میں چند اس دخواری پیش نہ آئی کیونکہ اس

روز جمعہ تھا اور کھاؤں سب معمول بچھر یا گھر میں گھوم رہا تھا۔

"تم، ہی کھاؤں ہو؟" افسر اعلیٰ نے نرمی سے پوچھا۔

"اہ، ہو جناب۔"

افسر اعلیٰ کی تھوڑی سی ملکھی بندھ گئی کیونکہ اس سے پیشتر اس نے ایسی دگراتی

ہوئی خوفناک آواز چڑیا گھر میں بھی نہیں سنی تھی۔ بہر حال اس نے خطا ہوتے اوس ان بحال کے اور نہایت دوستانت لجئے میں کہا۔ ”دیکھو کھاؤں، اگر تم وعدہ کرو کہ ہر روز چڑیا گھر آؤ گے بلاناغز، تو ہم تم سے داخلے کے پیسے وصول نہیں کیا کریں گے؟“
کھاؤں جو بڑے اطمینان سے چڑیا گھر کی سیر میں محو تھا اور جسے باعتماد کفر ک باقاعدہ در غلام کرو قدر میں آیا تھا قدر سے خوفزدہ تھا کہ شاید اس نے کسی بند روک جو اپنی باری روکنے کھلا دی تھی اس کی پاداش میں اس کی یوں پیشی ہو گئی ہے اب ایک گھر اسافس لے کر بولا۔ ”پر جناب میں تے بھوری کرناں۔ میں کیوں آوان بعذر عذرا۔“
اس پر باعتماد کفر ک اور افسر اعلیٰ نے اپس میں کچھ کھسپھسر کی اور چھربا اعتماد کفر کھاؤں کے کندھ سے پر بڑے بے تکلفا شہ انداز میں پانچ رکھ کر بولا۔ ”تمہیں وہاں کتنی بھوری میرا مطلب ہے مزدوری ملتی ہے؟“

”بھی پندرہاں روپے؟“

”ہم تمہیں تین روپے دیں گے؟“

کھاؤں پھر خوفزدہ ہو گیا۔ ”پر کیوں بھی؟“

”اس نے کہ ہم تمہیں بسند کرتے ہیں۔“ افسر اعلیٰ نے بھی باعتماد کفر کی پیسوی کرنے ہوئے کھاؤں کے دسرے کندھ سے پر ہاتھ رکھ دیا اگرچہ اسے سیاہ گوشت کے اس تودے کو چھوٹتے ہوئے کراہت سی محبوں ہوئی۔

”بند جی میں تے مسٹری غلام علی نال پنڈوں آیاں۔ اوہنوں پچھ لیو؟“

”اسے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ افسر اعلیٰ نے اس مسٹری غلام علی کے سکھ مزید کو اہت محبوں کرنے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بیان پر دو گئی مزدوری ملتے گی اور تم ایک ناوار اور مستحق شخص کی بجائے جلد از جلد صاحبِ ثروت فرد بن کر اپنے گاؤں لوٹ سکو گے۔ کیا تام ہے تمہارے گاؤں کا؟“

”کوٹ مراد؟“

”تو بس مٹھیک ہے تم ابھی جا کر اپنا سامان لے آؤ۔“

کھاؤں کے دانت و کھانی دیئے پھر اس کے اندر ایک گواری سی چلی اور
گھاں گھاں کرتا ایک قمقہ باہر آگیا۔

افسر اعلیٰ اور با اعتماد کلرک ایک دوسرے کے قریب بہت آئے کیونکہ ان کے
رو نجحے کھڑے ہو گئے تھے "ہمئے کیوں ہو؟"

"جی میرا تے سماں ای کوئی نئیں۔ بس ایسے کپڑے نہیں جتے دے؟"

"تو پھر محیک ہے کل سے تمہاری ڈیلوٹی شروع"

اگلے روز صحیح سورے بندوں کے پختے کے قریب ایک چار میٹر × چار میٹر کا چڑی
تھہرا تعمیر کیا گیا۔ اس پر کھاؤں کے نام کی سمجھی نسبت کی گئی اور کھاؤں کو ملا یا گیا۔

"اس پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ"

کھاؤں نے فرما تعمیر کی اور تھہرے پر چڑھ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

"نہیں درمیان میں بیٹھو"

وہ اٹھا اور درمیان میں جا بیٹھا۔

افسر اعلیٰ اور با اعتماد کلرک نے تسلی سے ہاتھ کلمہ اور جانے لگے۔

"پر جی میں مجروری کی کمرا؟" کھاؤں نے جلدی سے پوچھا۔

"پچھے بھی نہیں۔" افسر اعلیٰ بولا "بس اس تھہرے پر سارا دن بیٹھیے رہو اور

شام کو تینیں نیس روپے مل جائیں گے"

"پر جی۔" کھاؤں تھہرے سے اُتر آیا "میں دیلائیں رہ سکدا"

"کلام کے آدمی ہو بیکار نہیں بیٹھ سکتے" افسر اعلیٰ جھلا گیا اور پھر با اعتماد کلر
کو آنکھ مار کر بولا۔ اچھا تو پھر تمہاری مزدوری یہ ہے کہ تم سارا دن تھہرے پر بیٹھ کر
ہستے رہا کرو"

"اچھا جی۔" کھاؤں قدرے ہیرت سے بولا۔

"لیکن ابھی نہیں۔ جب چڑھا گھر کھلے گا تب"

پھر یا گھر کھلا تو کھاؤں ہنسنے لگا۔ دو پر تک اس کا گلا بیٹھ گیا مزدھنک

ہو گیا اور اس کا کالا گوشت پیسنے سے تر برہ ہو گیا..... وہ رزق حلال پر یقین رکھتا تھا۔ اسے بیان بیٹھنے اور ہنسنے کے پیسے ملتے تھے۔ اس لئے وہ ڈاکرتا رہا انور الدکان رہا..... اس کی رگنیں چھوپ گئیں اور چہرہ سیاہ ہونے کی وجہ سے سفرخ نہیں ہو سکتا تھا مزید سیاہ ہو گیا۔ اور اسی شام جب چڑیا گھر بند ہوا اور جانوروں کو خواراک دینے والے خاکر و بے کھالوں کے آگے وال کی رکابی اور چند روٹیاں ڈالیں تو وہ جانوروں کی طرح ان پر پل پڑا۔

یوں کھالوں کی نئی بھوری شروع ہو گئی۔ وہ رات کو خطرے پر، ہی سورہتا اور چڑیا گھر کے کھلنے ہی اس کے درمیان ایڑوں کے بل بیٹھ کر ہنئے لگتا۔ شروع شروع میں نزویتی پتھرے کے بند رجھی اسے چھوٹے بچوں کی طرح ولپی سے دیکھتے رہے اور رجھ رہنیں اس نے ہمسکے کی عادت ہو گئی۔ کھالوں کے لئے پہلی رات بول اس کے بڑی اوکھی ختمی کی پونک طرح طرح کے جانوبوں کی آوازیں اس کے لئے دہشت کا سامان بن رہی تھیں ہاسے خطرے کا اس سہوا مگر رجھرا اس نے سوچا کہ خطرہ تو یہ طریقے تھے وقت بھی موجود ہوتا ہے کہ کوئی بھی شہریہ تمہاری کھوپڑی پر گر کر اس کے نکلوے کر سکتے ہے۔ یا مصالغے سے لبرپر زدابڑے کو اٹھا کر جھولتی ہوئی سیرھی پر اپنے کچھ مارے جسے ہوئے پاؤں کے ساتھ تمہری منزل تک جانا بھی تو خطرناک ہوتا ہے تو پھر ملے پایا کہ رزق حلال کا نہ کی خاطر خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ اور بیان تو تمام درندے فی الحال بخوروں میں بند تھے۔ اب اسے ہنسنے کی مشق ہو چکی تھی وہ ہمدرد وقت نہیں ہوتا تھا بلکہ جب کبھی بچوں کا کوئی غول اس کے قریب آتا تو وہ انہیں محظوظ کرنے کی خاطر لگئے کی رگنیں چھولا کر گھاٹا گھا کرنے لگتا..... اس دوران وہ باقاعدگی سے شماز ادا کرتا رہتا البتہ اس کا قرآن پاک چھپ چکا تھا۔ ایک صبح وہ حسب عادت اس کی عبارت پر انگلیاں پھیپھیر کر اسے پڑھ رہا تھا کہ ایک باریش شخص نے اسے بد مرمتی نٹھر اکرم مقدس کتاب کو اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لیا تھا۔ ایک روز کسی شراری بچے نے اُسے چھوٹا سا سکندرے مارا۔ اس نے ماتحت کے

ہاتھ پھیرا اس کا خون بھی سیاہی مائل تھا۔ کھانوں نے اس شام افسر اعلیٰ سے شکایت کی "مینوں بال دھیماں مار دے نئیں۔ میں کوئی ہلکا یا ہو یا گلتے نہیں" افسر اعلیٰ نے متاثر سے سر پلایا اور اگلے روز کھانوں کے نام کی تھنی کے سامنے ایک اور تھنی نصب کر دی گئی "پھر مارنا منع ہے"..... پھر ایک روز کسی بچے نے اس کے سامنے روٹی کا ایک مٹکدا چینک دیا۔ روٹی کا مٹکدا شام تک وہیں پڑا رہا کھانوں نے اسی شام افسر اعلیٰ سے شکایت کی "میں متاثر نہیں مینوں لوک روٹی کیوں پاندھئیں؟" افسر اعلیٰ نے متاثر سے سر پلایا اور اگلے روز نام اور پھر مارنا منع ہے" کے پلوں ایک تھنی اور نصب کر دی گئی "کھانوں کو خواراں کھلانا منع ہے"..... اور ایک روز کسی نے یونہی ایک روپے کا فوٹ کھانوں کی طرف چینک دیا۔ کھانوں کا چہرہ سیاہ ہونے کی وجہ سے سرخ نہ ہو سکا مزید سیاہ ہو گیا۔ اور اس نے اسی شام افسر اعلیٰ سے شکایت کی "میں محوری کرناں" لوکی مینوں اللہ واسطے پیسے کیوں دیندے نیں؟" افسر اعلیٰ کی ذاتی اخلاقیات میں قریب نہیں عدہ بات تھی کہ یوں بیٹھے بھائے ہوٹ ملٹے جائیں بھر حال اس نے پھر متاثر سے سر پلایا اور اگلی صبح ایک اور تھنی کا "اھ ہو گی" کھانوں کو بھیک دینا منع ہے" اس کے بعد کھانوں ایک ہلٹن اور پر امن زندگی بسرا کرنے لگا۔ لوگ اسے دیکھنے آتے اور تھنیوں پر لکھی ہدایات پر عمل کرتے۔ البتہ کچھ عرصے بعد ایک آسودہ حال خاتون غفتے سے سرخ ہوئی ہوئی افسر اعلیٰ کے دفتر میں داخل ہوئی اور یہ خاتون اس لئے سرخ ہو سکتی تھی کہ اس کا رنگ یہ نہ تھا بلکہ انتہائی دودھیا اور ملائم سفید تھا۔ خاتون نے اتنی طاقت سے افسر اعلیٰ کی میز پر مٹکا مارا کہ افسر اعلیٰ جو قدرے خنودگی میں تھا فرا اچل پڑا کہ شاہزاد کوئی بہتر دغیرہ خواراں کی کمی کی شکایت کرنے بنسن لغیں اس کے دفتر میں گھس آیا ہے۔

"بھی فرمائیے" افسر اعلیٰ نے آسودہ حال خاتون کے آکرداہ پھرے اور آسودہ

لباس سے مر جو بہوتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ نے ایک نہایت خوفناک دندارے کو بر سر عام بٹھا رکھا ہے۔ خاتون گھولی۔"

”جز نہ ہے؟“ افسرا علی دوبارہ اچھل پڑا۔

”جی، اس سے آپ نے ایک تھرستے پر بھار کھا ہے۔“

”اچھا وہ.....“ افسرا علی مسکرا یا ”محترم خاتون وہ تو کھاؤں ہے۔“

”وہ ساہ اور کریمہ المنظر چیز جو بھی ہے خطرناک ہے۔ اس نے میرے بے بنی کو اس طرح گھوکر دیکھا کر بے چارہ بے بنی ابھی تک آپ نیت ہے۔“

”میں اس سے بات کروں گا کہ وہ آئندہ بے بیوں کو گھوکر رہ دیجے۔“

”بات ہے..... وہ“ خاتون نے اودہ کرنے ہوئے اپنی سختیاں کنپتیوں پر جائیں اور آنکھیں چھاڑ کر چھٹ کی طرف دیکھا۔ میں کہتی ہوں وہ خطرناک ہے اسے باندھ کر رکھنا چاہیے زنجیروں وغیرہ سے.....“

”لیکن خاتون وہ باقاعدہ جائز تو نہیں کہ اسے..... دیکھئے ہم ایک اور تھنکتی نسب کر دیں گے کہ یہ خطرناک ہے۔“

”تھنکتی سے کام نہیں چلے گا، کیا پچھوٹے بے بنی اسے پڑھ سکیں گے.....“

”لیکن خاتون.....“

”اسے فی الفور زنجیروں سے باندھ دینا چاہیے۔“ خاتون نے ایک ایک لفظ چلاتے ہوئے افسرا علی پر جیسے محتوا کا درست میں آپ کے بڑے افسر سے شکایت کردی۔

آپ جانتے نہیں کہ میں کس کی بیوی ہوں؟“

افسرا علی نے یہ جانے کی ہرگز کوشش نہ کی کہ خاتون کس کی بیوی ہے اور اسے ایک محتقول تجویز قرار دیتے ہوئے فوزاً حامی بھر لی۔

یہ وہی دن مختا جب کھاؤں کے لئے

ایک زنجیر لالی گئی۔

”کھاؤں یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں؟“

”میں کوئی جتو رستے نہیں۔“

”نہیں نہیں تم انسان ہی ہو جائز تو نہیں لیکن..... لیکن..... لیکن“ افسرا علی

نے زنجیر ڈالنے کے لئے کوئی مناسب قسم کا جواز نہ ملنے پر باعتماد کلرک کو گھوڑا جو فرا
گریا ہو گیا۔ مجھی کھاناں دراصل یہ تھڑا اخترناک ہے۔ تم اس سے نیچے گر سکتے ہو نہیں
پوٹ لگ سکتی ہے۔“

کھاناں نے ایک فٹ بلند چوتھے کی طرف دیکھا اور گھاں گھاں کرتا ہے۔
”میں نے کدمی تو بھی منزل توں نہیں دیا۔ ایکتوں کجھ ڈگ پوان گا۔“

دوفون نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ”اب کیا کریں؟“
خاموشی کے عقرو قفعے کے بعد افسر اعلیٰ ایک خبیدت مسکراہٹ سے لیں ہو
آگے بڑھا۔ دیکھو کھاناں ہم دوفون تمہارے دوست ہیں کمال ہے یاد دوستوں کی
اتنسی سی بات نہیں مانتے۔ رشا پاش۔“

”دوست؟“ کھاناں نے منز کھول دیا ”پھیر جو ہیں آگھو“
باعتماد کلرک پھرتی سے چوتھے پر چڑھا اور کھاناں کی دوفون پنڈلیوں میں رنجی
ڈال دیں..... زنجیر کھاناں سے بھی وزنی نہیں..... وہ اپنے دوستوں سے شکایت
تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر زنجیر کے بوجھ کی وجہ سے اب وہ ایڑلوں کے بل بیٹھیں
سکتا تھا چنانچہ اس نے پھر منز کھولا۔ پڑھی میں ایک بیسہ نہیں سکدا۔“

”اگر دوزن کی وجہ سے بیٹھتے میں دشواری پیش آرہی ہے تو بے شک اپنے دوفون
ہاتھوں کو استعمال میں لاو۔۔۔ یوں۔۔۔ باعتماد کلرک نے چوتھے پر چڑھ کر اپنی دوڑ
سچیلیاں زمین پر رھا کر کھاناں کی مشکل آسان کر دی۔

کھاناں نے بھی اپنی دوفون سچیلیاں زمین پر رکھیں اور سراہٹا کر ان کی طرف
دیکھا ”جی ایچ؟“ بالکل افسر اعلیٰ نے خوش ہو کر کہا۔

”جی ایچ تے جنور بمندے نہیں“ کھاناں نے پر تشویش لجھے میں کہا
”بالکل جانور اسی طرح بیٹھتے ہیں اور اسی لئے اتنے آرام سے رہتے ہیں
..... فکر نہ کر وہمیں عادت پوچھائے گی۔“
کھاناں کو زنجیر کی عادت ہو گئی۔

اسے جانوروں کی طرح بیٹھنے کی بھی مادت ہو گئی۔
وہ حواسِ حسندیری کے لئے بھی اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا اس لئے ایک خاکرو ب
چھوڑتے کی صفائی پر مامور کر دیا گیا۔

اب وہ پسید رہتا تھا۔ مقدس کتاب کے بعد نماز بھی چین گئی۔
چڑیاگھر کھلتا تو بچوں اور بڑوں کے غول اس کے چھوڑتے کے گرد ہو جاتے
وہ سراخھاتا اور ہنسنے لگتا۔ اس کی آواز مزید گلھھیا چلی تھی اور دھلا اس طور پھول
چکا تھا کہ اکثر اوقات گان ہوتا کہ وہ سہنس نہیں رہا جو نک رہا ہے اس
کی سمجھیاں اب تکوں کی طرح سخت ہو چکی تھیں زمین کے ساتھ جیسے جو چھپیں۔
پہلے پہل یوں کھڑا ہونے سے اس کی کمر میں شدید درد ہوتا تھا اور وہ اپنی ڈوپی
سر اجسام دینے کے بعد رات کے وقت تھوڑی دیر کے لئے دلوں سمجھیاں اٹھا کر
لگھے زمانوں کی طرح کھڑا ہو کر آرام کر لیتا پھر آہستہ آہستہ اسے صرف دلوں پاؤں
پر کھڑے ہونے میں وقت محسوس ہونے لگی اور ایک رات کھاناوں جب حسب معمول
آرام کرنے کی خاطر اپنے ہاتھ زمین سے اٹھانے لگا تو اس کی کمر میں اذیت ناک
درد کا ایک جھٹکا سالگا اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کی مگر اس
کے ہاتھ زمین سے جدا نہ ہو پائے، اگر ہوتے تو ان کی جگہ اس کا منہ جا گرتا۔ اس
نے صرف ایک ہاتھ زمین سے اوپر کرنے کی کوشش کی مگر وہ پھر اپنے آپ کو
سنپھال نہ کر کا اور گر گیا انھی صبح کھاناوں کی آنھیں مرثیہ تھیں اس لئے کہ
وہ سیاہ رنگیں اس لئے مرثیہ ہو سکتی تھیں۔

کھاناوں کو روزانہ نیس روپے رنقتِ حلال کی صورت میں ملتے رہے۔ وہ ہفتا تا
اور اپنے خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے اسے دو کی بجائے چار پاؤں
لگا دیئے تھے۔

پھر ایک اور سر کلرا گیا۔
”جلدی جلدی ہمارے چڑیاگھر کے بہترین جانور، اونٹ، ہاتھی، شیر، مگر مجھے“

سائب بندر دعیہ ... فرداً — افسر اعلیٰ ایک ہنریائی کیفیت میں بدلانظر آتا تھا۔
”اہمیں وزا پورٹ ایبل پنجروں میں بند کیا جائے ہم کل میں روانہ ہو جائے گے“

”منیر کمال کے لئے؟“ باعتماد مکر نے بعد ادب دریافت کیا۔

”یہ“ افسر اعلیٰ نے تازہ سرکلر ہوا میں لرا یا“ ملک صرف شہروں کا نام نہیں اس میں دیبات بھی ہیں اور دیبات آبادی ان دلوں قدر سے ناخوش ہے اور ہمارا فرن ہے کہ ہم ان کی تغزیج کا بھی عیال رکھیں چنانچہ اونٹ ہاتھی شیر“

”جناب میں سمجھا نہیں ہے باعتماد مکر نے پھر بعد ادب کہا۔

”افسرانِ بالا کا حکم ہے کہ ہم ایک سفری چڑیا گھر ترتیب دیں اور ملک کے دیبات میں جا کر جنگلی جاؤزوں کی نالش کریں تاکہ وہاں بھی موجود میلے کی ایک کمیت پیدا کی جائے۔ چنانچہ اونٹ ہاتھی، مگر مجھے، شیر“

”مگر جناب مگر مجھے تو نہیں جاسکتے، ان کے لئے پانی درکار ہوتا ہے“

”مگر مجھ پر بنیادی طور پر خشکی کا جائز ہے“ افسر اعلیٰ نے اپنے ماحت کو

ڈالتا پڑا۔ ہم اہمیں پیک کر کے لے جائیں گے اور ہر گاؤں کے جو ہر میں پھوڑ دیں گے“
”بہت مدد بخوبی ہے جناب“ باعتماد مکر نے پھر بعد ادب کما اگرچہ اسے بھی سے تشویش شروع ہو گئی تھی کہ بعد میں ان مگر مھپوں کو جو ہڑوں سے نکالاں جر جائے گا اسے معلوم مختاک بالآخر یہ کام بھی اُسی کے پرہد ہو گا۔

اُگلی صبح جب تمام مقبول ترین درندے پر پورٹ ایبل پنجروں میں بند کئے جا چکے تھے تو باعتماد مکر نے افسر اعلیٰ کے کان میں صرف ایک سرگوشی کی۔

”درست بالکل درست اسے بھی پہنچے میں بن کر دیا جائے“

”مگر جناب یہ اچھا نہیں لگتا۔ بہر حال وہ اتنا زیادہ جاؤز تو نہیں ہے“

”درست بالکل درست سہیں انسانی اقدار کی پا سبانی کرنی چاہئے اس کے لئے زنجیری کافی ہے“

وہیات میں سفری چڑیا گھر کی دھوم مجھ گئی ہر گاؤں کے باہر جاؤ ہوں کی نمائش ہوتی اور مگر ہم ہوں کو قربی جو ہر میں ڈال دیا جاتا۔ کسان اور مردوں پیشہ لوگ اپنے کام کاچ ترک کر کے بھینٹلے ادا لئے ہوئے اس نئے میلے میں شرکت کے لئے آتے اور کھاد کی کمی پانی کی کمی آزادی کی کمی وغیرہ کو چند ہم ہوں کے لئے محلا دیتے۔ الگی صبح مگر ہم ہوں کو جو ہر ہوں میں سے نکالا جاتا اور ہر دفعہ ایک آدم مگر چھپ کم ہوتا اور سفر بجاري رہتا سفری چڑیا گھر کا تجربہ کامیاب ہو رہا تھا۔ وہیات میں بھیجی کا گراف و قمی طور پر کم ہو رہا تھا البتہ افسر اعلیٰ کے علم میں یہ بات لالی گئی کہ اگرچہ اونٹ پاہنچی مگر چھپ وغیرہ بڑے ہٹ جا رہے تھے مگر کھاؤں کے چوتھے کے پاس بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے تھے۔ بختیق پر معلوم ہوا کہ وہیات نے اکثر فوجوں کی شکلیں کھاؤں سے ملتی جلتی تھیں اور انہیں اپنے جیسے ہی کسی جاؤز کو دیکھنے میں دچپی ترجمی بلکہ ان کی آنکھوں میں قدرے ناپسندیدگی کے جذبات تھے شاید کھاؤں کے لئے، شاید افسر اعلیٰ کے لئے کھاؤں ان فوجوں کے سامنے سر جھوکا لے بیٹھا اور جب بھی وہ اوپر دیکھتا اسے اپنی تصویریں ہوت کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ اس نے ہنسنا ترک کرو دیا۔ اب بھی رزقِ حلال پر اس کا پختہ ایکان تھا مگر سفر کے ساتھ ساتھ، فوجوں کے چہروں نے زمینوں کی قربت نے، تکھیدتوں کی بارے اس کے سیاہ جیسے کو ایک عجیب طرح کی جھیپسی کے قریب کروایا جو اس پر ایک آری کی طرح چلنے لگی، کھاؤں کے اس دماغ پر جس میں محض بھرا ہوا تھا چھکاریوں کی صورت گز نے لگی اب وہ اپنے آگے کمی ہوئی خود کو بھی منہ نز لگاتا اور جھوکا بیٹھا رہتا، نگرانِ عمل چکپے سے یہ خوارک چٹ کر جا رہا کہ وہ بہر حال انسانی خوارک تھی۔

مسلم فاقوں سے کھاؤں کا وزن کم ہونے لگا۔ اس کے بعد کی سیاہ زمین میں

دراڈیں پڑ گئیں۔ آنکھوں کی پھر کپوں کی حرکت مدھم ہونے لگی..... اختر اعلیٰ اور باتوں کی کلرک اپنی بے مثال کامیابی پر اتنے پرست نتھے کہ انہیں کھاؤں کی طرف دیکھنے کی فرضت ہی نہ ملی۔

ایک روز کھاؤں نے اپنی اصلی طانگ ہلنی، زنجیر جو ہمیشہ پنڈلیوں سے اوپر چینی رہتی تھی ایک چھنا کے سے ٹھنڈوں پر آگئی۔.....

اسی شام قریب سے گزرنے والے کے کسی شخص نے اس کے گاؤں کوٹ مراد کا نام لیا "کوٹ مراد؟ کھاؤں نے زمین میں پورست ہمیلیوں کو اٹھانے کی کوشش کی اور حسپ مہول منہ کے بل گز گیا۔ وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ ایک خاکروب جب رات کے کھانے کی رکابی اس کے آگے رکھنے آیا تو کھاؤں نے وہ ہیں پرے پرے پوچھا "بھائی جی کلی سادھا پڑھی مگر کمیرے پنڈ جائے گا؟"

"کل کوٹ مراد میں جانوروں کی نالاش لگے گی" خاکروب نے جاتے جاتے جواب دیا کھاؤں کے دماغ میں بھرا تام تر بھس سلکنے لگا۔
"کھاؤں"

"پھر مارنا منع ہے"

"کھاؤں کو خواک گھلا نامنع ہے"

"کھاؤں کو بھیک دینا منع ہے"

"کھاؤں یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں؟"

"میں کوئی جنور تے نہیں"

میں جنور تے نہیں..... میں جنور تے نہیں۔ کھاؤں کے اندر بے شمار گواریاں سی چلنے لگیں اور ان میں سے ایک گھاگھا کرنی آواز آئی میں جنور تے نہیں۔ اس خور میں ایک کالی کوئی بھی کمی، کوٹ مراد۔ کوٹ مراد..... لفڑی شب کے قریب کھاؤں نے نعد لگا کر پاؤں کھینچنے تو ٹھنڈوں کے گرد گوشت کو چھیلتی ہوئی زنجیر کی اذیت نے اسے کراہنے پر جنور کو دیا۔ "کوٹ مراد" کالی کوئی بھی اور اس نے اپنے بھجنے ہوئے

بھیج کر پھر نور لگایا "کوٹ مراد" کوں کوئی اور اس کے کالے بدن سے پہنچتے پانی کی طرح
بہنے لگے "کوٹ مراد" اس کا بدن کوکے لگا۔ اور اس نے پھر نور لگایا اور انہوں
کے اوپر کا گوشت چھلتا چلا گیا۔ خون کی رطوبت نے زنجیر کی سختی کو فرم کیا اور کھاؤں منہ کے
بل گر گی بلکن وہ اس مقام سے ایک ہاتھ آگے جا کر گرا جاں پر وہ ہمیشہ گرتا تھا،
زنجیر اور اس کے پاؤں کے درمیان بھی ایک ہاتھ کا فاصلہ تھا..... وہ پہنچتا ہوا
چوتھے سے اُترا سفری چڑیا گھر کے میدان سے باہر آیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور پھر
چاروں پاؤں پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس حالت میں وہ ماؤں بیٹھا رہا تھا
اس طور چلنے کی یہ سلسلی کوشش تھی۔ اگلے زانوں میں وہ زمین کو بلندی سے دیکھتا تھا
اور آج وہ اس پرناک کو گرمیا ہوا چل رہا تھا..... اس کی سہیلیاں تو پاؤں کے نوں
کی ماں سخت ہو چکیں مل جگلی گھاس اس کے غتوں کو چھپید رہی تھی اور اسے سانتے
دیکھنے میں وشوادی پیش آ رہی تھی اور اس میں صرف گھاس تھی..... وہ تیز تیز جھانگنے لگا۔
سرکنڈوں کی تیز دھاریں اس کے جسم پر اذیت کی لکریں کھینچ رہی تھیں۔ ہر سرکنڈ اس
پہنچنے اور خون میں ڈوبے ہوئے سیاہ بھاگتے ہوئے بدن کی کمر کے گرد بندھے ہوئے
خونرک پڑے کی ایک دبھی اپنی لونک سے اچک لیتا تا آنکھ یہ پہنچنے اور خون میں ڈوبا بہا
سیاہ جسم صرف ایک جسم نظر آنے لگا۔ بھاگتا ہوا زبان نکالے، سالن کے لئے ہونکتے
ہوا بھاگتا ہوا..... گھاس اور سرکنڈوں کا میدان ختم ہو گیا۔ آگے ایک سو کھا ہوا راجا جاہ
تھا وہ پاؤں جا جما کر پیچے اُترا اور پھر دسرے کنارے پر چڑھنے لگا۔ راجا جاہ جبور
کرنے کے بعد اس نے عسوں کیا کہ جنگلی گھاس اور سرکنڈوں کا میدان ختم ہو چکا ہے
اور اس کی جگہ ایک بزرگی ہے جو اس کے جسم کے گرد پھیل رہی ہے۔ اس کے پاؤں
تلے مٹی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سہیلیوں کو زمین کی گرفت سے آزاد کرنے کے لئے
نور لگایا اور ایک مرتبہ پھر اوندوں سے منہ گر گیا۔

اس کی ناک پھر بھری مٹی میں دھنن گئی اور اس کے کھلے منہ کو بھی مٹی نے
پر کر دیا اس نے ہاتھ پھیلائے سہیلیاں کھوں کر زمین پر رکھیں، انہیں مٹی کے آٹا

کیا دھنکا ہوا اسی صالت میں اونہ سے منہ پڑا رہا..... پھر اس کے نتھے ایک پیاسے پرندے کی طرح پھر اپھر ائے اور اس نے ایک طویل سالن لیا، باڑیک مٹی اور اس کی بات ہوا کے سامنے کر ایک میانی دھندر کی صورت اس کے بدن میں اُتری اور شربیاں میں چھلکتی گئی۔ اس نے گرد آلو دبیوں پر زبان پھیری اور اس کا صوت اپنی مٹی کے ذائقے کی پہچان سے آشنا ہوا..... اس کا بدن مٹی مٹھا اور اس کا رنگ مٹی کا رنگ تھا..... گندم کی بالیاں اس کے سوہنے سرسر اسی تھیں اور یہ بالیاں اس کے بدن کی مٹی میں سے بچوٹا رہی تھیں۔ اس نے ایک اور گھر اسالن لیا اور سر اٹھایا اور پھر جس طرح اس کی ماں نے سکھایا تھا۔ اور جس طرح کہ اس کی مٹی نے بتایا تھا اور جس طرح کہ وہ ہمیشہ سے تھا۔ اور جس طرح وہ بدن بلا تردد اس کا کہنا مانتا تھا اس نے مٹی سے مجری سمجھیاں اٹھائیں اور سر اٹھا کھڑا ہو گیا..... سامنے کوٹ مراد تھا۔

اُو

روح کو تنخ کر دینے والی ایک تاریک آواز قبرستان میانی صاحب کی نئی
پرانی قبروں اور گرد آلو و کنبوں پتوں اور سوکھی ہوئی شنبوں میں سفر کرتی گئی... "اُو"
مگر ان آڈیو میں ہر بڑا کرنگ مرمر کی سل پر سے اٹھ بیٹھا جو میری نشست
نمیں اور مجھے شاید لیقین ہو اکر یہ آواز اس کی ہے جو اس سل کے نیچے دفن ہے
اس پر میرا بوجھ پڑا تو پکار اٹھا کر "اُو" ...

وہ آہستہ چلتا آرہا تھا اور اپنے سامنے دیکھتا تھا۔ اس کے سر پر ایک
دابڑہ تھا۔ دھوپی ٹھیکن پسے ہوئے تھا۔ باریش تھا، دیوار نگتائیں تھیں اور سبی
تھا جو بلاتا تھا، آواز دیتا تھا کہ "اُو"..... پر پڑتے نہیں کس کو آواز دیتا تھا.....
ان کو جو اس قبرستان میں دفن تھے یا ان کو جو اس قبرستان کے اوپر تھے اور یہ
انہیں بلاتا تھا۔ بوجھوں چلے تھے کہ کبھی بلا دا آئے گا اور یہ بلاتا تھا، موت

کی طرح بلا رہا تھا۔ ”آڈ۔“ یہ آڈ وہ ایک خاص انداز میں کتا، ایک ایسا انداز جس میں کچھ کچھ غرائب اور حکم آور ہونے کی گیفیت تھی، اگر یہ شخص رات گئے گھر واہی پر آپ کے کام میں اسی طرح ایک عدۃ آڈ پکار دے تو حکمت قلب بند ہو جانے کے شدید امکانات ہو سکتے تھے۔

میں اس روز صیانتی صاحب میں تھا۔۔۔ من مردنی سے نہیں گیا تھا کیونکہ انسان اگر قبرستان جاتا ہے تو صرف دوسروں میں ۔۔۔ پہلی یہ کہ وہ کسی کونہ صادیتے دیتے دہاں پہنچ جاتا ہے اور دوسرا دہی جس سے وہ بھاگتا بہت ہے مگر پکڑا جاتا ہے یعنی لوگ اسے کند صادے کر دہاں پہنچا دیتے ہیں ۔۔۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لئے کوئی بہت بڑا دماغ نہیں چاہیے کہ میں پہلی صورت کی وجہ سے دہاں تھا۔ اگر دوسرا صورت کی وجہ سے ہوتا تو یہ لکھنے لکھانے کا فریضہ میں نہیں بلکہ میرے دوست دا جانا سرانجام دے رہے ہوئے کہ آہ عجوب بیزار ہر دم تھا۔۔۔ بہر حال میں ایک دوست کی والدہ کے جنازے کے ہمراہ قبرستان یا نی صاحب پہنچا تھا۔۔۔ پہلی مرتبہ قبر کھو دی گئی تو لا حجین کو اس کا ڈیزاٹ پسند نہ آیا۔ دوسرا مرتبہ اس میں کوئی تینکنی خامی نہ گئی، جتناچہ اب گورن حضرات بیچوں سے بھر جبری مٹی کو تھیکنے ہوئے وہ خامی دور کر دے سکتے، اور جنازے کے سامنے آکے ہوئے بیشتر حضرات آنکھ بچا کر گھر دلوں پر نگاہ دلانے ہوئے پچکے پچکے کھسک رہے تھے۔ وہ اُس راستے سے کھسک رہے تھے جہاں پر بُرمی بیٹھنڈی پڑی تھیں اور اکیلی پڑی تھیں کیونکہ بیٹے اور پوئے، قبر کی تینکنی خامی وہ کروانے میں مگن تھے اور اس طرح مگن تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہماری والدہ نے کون سا روز روز مرنا ہے قبر تو دھنگ کی ہوئی چاہیے ۔۔۔ میں بھی اسی سوچ میں تھا کہ کوئی دیکھ تو رہا نہیں، حاضری قوٹلگ گئی اس لئے یہاں سے چل دیں چاہیے اور یہ دہی وقت تھا جب ول کو تھنڈا کر دینے والی یہ آڈ از قبرستان یا نی صاحب کی نئی پرانی قبروں اور گرد آکو کتبوں، پتوں، سوکھی ٹینیوں میں سفر کرنی مجبود تک آئی ۔۔۔ ”آڈ۔“ اس آواز میں ایک یہو اتنی غرائب تھی۔ بھی تھی۔ جو لاکھوں قبروں پر

گوئی تھی... آؤ نہر پاپیک دا بڑہ جس کے کناروں سے چھپڑے لٹک رہے تھے اور
اس کی آنکھوں کے آگے لٹک رہے تھے، جیسے بھالریں ہوں... آؤ

اور پھر وہ آنے لگے، جنہیں وہ آؤ کہ کہ کر بلا تھا۔

بیٹھی ہوئی قبروں میں سے گرد اکو مقاموں میں سے، دھستے ہوئے تالابوں
میں سے، ان راستوں پر سے جو پتہ نہیں کہاں سے آتے تھے.... وہ آئے... بلیوں
کے سرخوادار ہوئے.... سیدنکروں کی تعداد میں خراقی بیان اور پھر کئے آئے سو شنختے دین
ہلاتے.... درجنوں کی تعداد میں..... اور پھر ہمارے اوپر کوئے سورجی میانے لگے۔
ایک گدھ اپنے ہی بوجھتے دبتا شیخ ہوا اور کیک پر بیٹھ کر گردان کھینچتا گیا.....
تب اس شنخ نے سر سے دا بڑہ آتا را، جس کے کناروں سے چھپڑوں کی بھالریں
لکھتی تھیں، اسے ایک قبر پر رکھا اور اس میں سے چھپڑے نکال نکال کر کچی چیزیں
پر اور ان کی درمیانی جگلوں پر اور کتوں پر پھینکنے لگا... آؤ وہ پکارتا جاتا اور وہ
آتے ہی گئے۔ وہ آتے اور اسے چھپڑے پھیلاتے ہوئے دیکھتے اور کھڑے ہو جاتے،
خراطے رہتے، وہیں ہلاتے مکڑا چھپڑوں کو منہ نہ لگاتے بس کھڑے رہتے اور وہ ان
کو چھوٹی ٹری کچی چیزیں قبروں پر پھیلاتا اور... آؤ... آؤ... جب دا بڑہ خالی ہو گیا
تو اس نے ایک پکتے برتن میں پانی بھرا اور ان کے درمیان رکھ دیا۔۔۔ تب اس
نے ایک اور آؤ کہا جو سپلے آؤ سے مختلف تھا۔ دھیما اور آخری جیسے اجازت نامہ
ہو اور وہ سب اپنی اپنی جگہ سے اٹھتے، حکمت کی اور وہیں ہلاتے، ہوتے اس
ضیافت سے لطف اندوڑ ہونے لگے؟ اور وہ اس طرح نہیں کھارہ رہے تھے جیسے
ہم لوگ باراتوں میں کھاتے ہیں اننانوں اور دشیوں کی طرح بلکہ جانوروں کی طرح
کھارہ رہے تھے، تخلی سے اور اطمینان سے۔

”یر قبروں پر چھپڑے کس نے پھینکے ہیں؟“ ایک صاحب جو قیر کے ڈیزائن
کی نگرانی کر رہے تھے، سستا نے کی خرض سے ادھر آکے اور کتوں، بلیوں اور
کوڈوں کو قبروں پر چہل قدمی کرتے اور کھاتے پیتے دیکھا تو وہ بھی خڑائے.....

کس نے پھینکے ہیں؟”
”میں نے...“ اس شخص نے اطمینان سے کہا، وہ دھونی کے پاؤ سے مانتے کو پوچھتا ہوا بولا تھا۔

”گزرے چھپڑے قبروں پر پھینکتے ہو...“ وہ صاحب پھر غرماً ہے...“
اس طرح قبروں کی بے خوبی ہوتی ہوتی ہے۔
”لو“ وہ میری جانب دیکھ کر بولا ”وہ تو یو لئے نہیں جو قبروں میں ہیں اور یہ بولتا ہے۔“

”اٹھاؤ ان کو...“ وہ صاحب اپنی دارجی کو منظی میں دباتے ہوئے اُبلى۔
”آؤ“ اس نے ان صاحب پر ایک نگاہ ڈالی اور نظرہ لگایا۔

وہ صاحب مخنوڑے سے لمبے اور بڑے بڑے ہوئے قبر کی طرف چلے گئے۔

”جب تمہاری قبر ہو گی تو اس پر نہیں پھینکوں گا“ اس نے مسکرا کر کہا اور پھر مجھے سے مخاطب ہوا ”قبروں والے اختلاف نہیں کرتے، یہ کرتا ہے...“ وہ اٹھا اور ایسے چھپڑے جو منی میں لمحہ گئے سختے اور جانوروں کو نظر نہیں آتے متنے اٹھا اتنا کران کے آنکے ڈالنے لگا۔

”کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”دردی ہوں، کپڑے سیتا ہوں“ اس نے سر بلایا۔

”اور یہ کام...“

”بائی گنوں نے کہا تھا کہ بیٹے جانوروں کو خوش رکھو“

”کب کہا تھا؟“

”پچاس سال پہلے... اور تب سے اب تک“

میں نے قبر کی جانب نگاہ کی اور اندازہ لگایا کہ ابھی کچھ وقت لگے گا میرے دوست کے بھائی بھی بور ہو کر ادھر ادھر گھوم رہے مختے۔ ان کی چار بیجے کی چائے کا وقت ہجور ہا تھا۔ چنانچہ میں نے اس بابلے کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

"میں بس ابھی گیلا گیلا، ہی تھا کہ ماں مجھے بابے مجنوں کے پاس اٹھا لائی۔۔۔" دہ کتوں کے تیزی سے چلتے بجڑوں اور بلیوں کے لگنے کی رگوں کو دیکھتا تھا اور دوست "میں فردا سا بڑا ہوا تو ماں گرگئی، پھر بابا مجنوں مر نے لگا تو میں نے نونے ہوئے کہہ بابا جی میں آپ کی خدمت نہیں کر سکا، کوئی خدمت بتائیے۔۔۔ بابا جی نے یہ خدمت بتادی۔ اب پچھلے پچاس برس سے صبح اور دوپہر آتا ہوں۔ غلے اور بازار کے حصاب میرے لئے پچھڑپڑے رکھ پھوڑتے ہیں اور میں صبح کر کے لے آتا ہوں۔۔۔" "اور جس روزگوشت کا ناخدا ہوتا ہے، جب کیا کرتے ہو، کتوں کو سیزیاں کھلاتے ہو۔۔۔"

اس نے اس سوال میں چھپی خباثت کو محسوس کیا اور بولا "مرعن تو ہوتے ہیں نا۔۔۔ کبھی کھاتے ہیں؟"

"کوئی بال پچھے بھی ہے؟"

"آہو۔۔۔ دو بیٹے ہیں۔ ایک کو میں ساختہ لاتا تھا، دو چینے ہوئے وہ کراچی بھاگ گیا نامایم کا بچہ، کہتا تھا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ روزانہ پچھڑپڑوں سے بھرا ہوا دا بڑہ اٹھایا اور مُرووں کے گھر دل میں جا کر بھانک شروع کرو یا۔۔۔ اسے کیا پتہ بابا مجنوں کیا تھا۔"

"اوہ یہ جالوز کھماری آواز پہچانتے ہیں؟"

"آہو۔۔۔ جمال کہیں، ہوں آجاتے ہیں۔۔۔ میرے تین چار اڑے ہیں۔۔۔ یہ پلا ہے۔ ایک اڈے پر تو میری سرکار نیو لے بھی آتے ہیں۔ اور قبروں میں رہنے والے ایسے ایسے جائز، ایسی مخلوق کر لیں۔۔۔ ویکھو تو حیران ہو جاؤ۔۔۔ مُردے کھانے والے ہوتے ہیں۔۔۔ اس لئے جس دن مُردے کم آئیں تو وہ زیادہ بھوکے ہوتے ہیں۔"

گرمی کے باوجود میری ریڑھ کی ٹھی میں ایک برفی کیفیت اثر کرنے لگی، بلیوں کی خدا ہست کم ہو گئی، شاید ان کی عبوک ختم ہو جھی مخفی۔ کئے کچھ کشست ہو رہے تھے۔

اور کوئے اس پاس کے کیکروں پر جای سمجھتے تھے۔ وہ اٹھا اور ان چھپڑوں کو اٹھانے لگا جو نجی گئے تھے، انہیں دابرے میں ڈال کر اسے سر پر اٹھایا اور آواز دی، "او..... بلیں ان راستوں پر والپس ہوئیں جہاں سے آئی تھیں، کتنے بھی دمیں ہلاتے روپوش ہو گئے اور کوئے بھی اڑ گئے۔

"بابے جنون نے کبھی یہ نہیں کہا کہ انہوں کو بھی خوش رکھو.... انسان بھی تو بھوکے ہوتے ہیں..... پیاسے ہوتے ہیں"۔
 "کیا تم قیچھرے کھالو گے....." وہ دابرے کو تھپک کر بولا۔
 "نہیں... لیکن...."

"آؤ" اس نے کہا اور ادھر چلا گی جدھر سے آیا تھا۔

میرے دوست کی والدہ کی قبر ابھی تک کھودی جا رہی تھی۔ کبھی وہ چوڑی زیادہ ہو جاتی تھی اس کا زادہ نہ ہے نظرے قابل اعتراض ہو جاتا اور کبھی وہ اندر سے ڈھنے جاتی اور مٹی سے پُر ہو جاتی۔ اب میرا دوست بھی اکتا چکا تھا اور ہر قسم پر اپنی والدہ کو دفن کر کے گھر کی عافیت کو لوٹنا چاہتا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور ایک او اکار کے او اس اور مفہوم چہرے کے ساتھ کوئی بہانہ تراشا اور اجازت لے کر قبرستان سے باہر آگیا۔

اس "آؤ" اور اس "آؤ" کے درمیان زندگی میں بہت کچھ ہوا اور اس "بہت کچھ" کی تفصیل بیان کرنا اتنا ضروری بھی نہیں، چنانچہ بہت سی راتوں کے بعد کوئی ایک رات تھی۔ میں بستر میں تھا، رات کا کوئی سا پر تھا اور میں سوتا تھا کہ کسی نے سرگوشی کی "آؤ"۔

میں ہر بڑا کمر اٹھا بیٹھا۔

"کون ہے؟" میں نے آواز دی۔

"کون ہے؟" میری بیوی نے اٹھ کر دریافت کیا۔

"کون ہے؟" بچوں نے بھی سوال کیا۔